© rasailojaraid.com

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تقسیم کے بعد

(۱۴)

از سعید احمد اکبر آبادی

یونیورسٹی کی ایک قدیم روایت ہے کہ جلسۂ تقسیم اسناد (convocation) کے موقعے پر چانسلر، وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر اور مہمان خصوصی، یہ سب ترکی ٹوپی بر سر اور رنگین و مطلا جبہ دربر ہوتے ہیں، افتتاح قرآن مجید کی تلاوت سے ہوتا ہے جو یونیورسٹی کے قاری کرتے ہیں، پھر جب ہر فیکلٹی کا ڈین اپنے ہاں کے کامیاب امیدواروں کو وائس چانسلر کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس وقت اس کا خطاب وائس چانسلر سے اور اس کے جواب میں وائس چانسلر کا اعلان کہ میں ان طلبار کو ڈگری دینا منظور کرتا ہوں، یہ سب کچھ عربی زبان میں ہوتا ہے، ان دونوں کے لئے مخصوص عربی عبارتیں ہیں جو بعینہا محفوظ چلی آرہی ہیں، جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر ہر ڈین اور وائس چانسلر کو یہ عربی عبارت بر نوک زبان یاد کرنی ہوتی ہے، زیدی صاحب کو اسلامی کردار تو بڑی چیز ہے، یونیورسٹی کے روایتی کردار تک کا اتنا خیال تھا کہ ایک مرتبہ کورٹ کی میٹنگ میں ایک صاحب نے رزولیشن پیش کیا کہ کنووکیشن کے موقع پر ڈین اور وائس چانسلر جو فارمولا عربی میں پڑھتے ہیں وہ اردو میں پڑھیں، لیکن زیدی صاحب نے اس پر بحث کی ضرورت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی محسوس نہیں کی اور ان کی درخواست پر محرک نے تجویز واپس لے لی، اسی طرح کورٹ میں ایک مرتبہ موسیقی کا ایک شعبہ قائم کرنے کی ایک صاحب نے تجویز پیش کی تو معمولی گفتگو کے بعد زیدی صاحب کے ایما پر محرک نے اسے بھی واپس لے لیا۔

زیدی صاحب کو مسلمانوں کی زبوں حالی اور پسماندگی کا شدید غم اور دکھ ہے انھوں نے مجھ سے بارہا کہا: مولانا! کوئی مسلمان لڑکا جو فرسٹ کلاس ہو، چاہے وہ کیسے ہی غریب گھرانہ کا ہو میرے پاس لے آیئے، میں اس کو ضائع نہ ہونے دوں گا، اور فی الحقیقت ہوا بھی ایسا ہی! متعدد لڑکوں کو میں جانتا ہوں کہ انتہائی غریب گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن فرسٹ کلاس تھے، زیدی صاحب نے ان لڑکوں کی ہر قسم کی مدد کی اور آج یہ لڑکے ہندو بیرون ہند میں عزت اور خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا نواب علی یاور جنگ کے زمانہ میں جو فتنہ و فساد ہوا اس کا سبب ہی یہ تھا کہ انجینئرنگ کالج میں مقامی طلبار کا جو کوٹہ مقرر تھا نواب صاحب اسے ختم کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کے برعکس زیدی صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ یونیورسٹی کے میڈیکل کالج کے ہاسپٹل کے لئے اتر پردیش گورنمنٹ کو رقم دینی تھی، لیکن گورنمنٹ نے شرط یہ لگائی کہ میڈیکل کالج میں داخلہ کے لئے یونیورسٹی کے طلبار کا کوئی کوٹہ نہ ہوگا۔ زیدی صاحب نے اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، بہت دنوں تک بات چیت چلتی رہی، گورنمنٹ اپنے موقف سے نہیں ہٹتی تھی اور زیدی صاحب اپنی ضد پر ڈٹے ہوئے تھے، آخر گورنمنٹ کو زیدی صاحب کے مطالبہ کے مطابق پچاس فی صدی کا کورٹہ تسلیم کرنا پڑا! ع

به بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ستمبر ۶۲ء میں جب میں ایک برس کی رخصت پر کناڈا جانے لگا اور روانگی سے پہلے کی شب میں ایس ایس ہال کے ڈائننگ ہال میں میرا وداعیہ ڈنر ہوا تو مختلف شعبوں کے پروفیسروں اور اساتذہ وغیرہم کے ساتھ زیدی صاحب بھی اس میں شریک تھے اور ڈنر کے ختم پر میری نسبت اپنے مشفقانہ خیالات اور جذبات کا اظہار بھی فرمایا تھا۔ یونیورسٹی کے تعلق سے یہ میری اور ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی آخری ملاقات تھی، میں کناڈا ہی میں تھا کہ زیدی صاحب اپنے عہدہ کی مدت پوری کرکے سبکدوش ہوگئے، علی گڑھ واپس پہونچا تو سنا کہ زیدی صاحب کو علی گڑھ سے رخصت کرتے وقت اساتذہ اور طلبا نے اپنے قلبی رنج وملال کا اور ان کی ذات کے ساتھ محبت اور احترام کا جو عظیم الشان مظاہرہ کیا ہے وہ یونیورسٹی کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

زیدی صاحب کے زمانہ میں یونیورسٹی کے چند اعلیٰ عہدہ دار

اوپر جو لکھا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ زیدی صاحب نے یہ سب کارنامے تن تنہا اور بنفس نفیس انجام دے ڈالے، درحقیقت کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا قابل اور لائق اور مضبوط عزم وارادہ کا انسان ہو، کسی ادارہ کی ذمہ دارانہ خدمت کے عہدہ سے اس وقت تک سبکدوش ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کے ساتھ اچھے رفقاء کی ایک جماعت نہ ہو اور اس کو ان سب کا تعاون حاصل نہ ہو، ایک اعلیٰ درجہ کے ایڈمنسٹریٹر کی پہچان یہی ہے کہ وہ خود محنت، ایمانداری اور قابلیت سے کام کرتا ہے اور اپنی پسند کے ساتھی منتخب کرکے ان سے کام لیتا اور ان کی رفاقت سے خاطر خواہ فائدہ بھی اٹھاتا ہے[1]، اس بنا پر ضروری ہے کہ اس عہد کے اُن چند اعلیٰ عہدہ داران یونیورسٹی کا بھی اس موقع پر تذکرہ کیا جائے۔ جو زیدی صاحب کے دست وبازو اور دل سے ان کے معاون اور مددگار تھے، اس سے آپ کو اس زمانہ کے یونیورسٹی کے ماحول اور فضا کا بھی اندازہ ہوگا۔

---

[1] جب میں ۴۹ء میں کلکتہ مدرسہ کا پرنسپل مقرر ہوکر وہاں پہونچا تو میرے استاذ شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب (دہلی یونیورسٹی) مرحوم نے مجھکو کراچی سے مبارکباد کا خط لکھا اور تحریر فرمایا: اس بات کو نہ بھولنا کہ تمھاری کرسی وہ ہے جس پر دس برس تک سر ڈینی سن راس بیٹھا ہے، لیکن ڈینی سن راس دوسروں سے خوب کام لیتا اور خود کام کم کرتا تھا، تم سے امید ہے کہ تم خود بھی کام خوب کروگے اور دوسروں سے بھی اسی طرح کام لوگے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیدنا اس زمانہ میں یونیورسٹی کے چانسلر تھے | سیدنا طاہر سیف الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اگرچہ وہ مسلمانوں کے ایک خاص مذہبی فرقہ کے امام اور روحانی پیشوا تھے، لیکن نہایت متقی اور پرہیزگار اور عابد شب زندہ دار تھے، معمولی شعائر اسلام کا بھی بہت خیال رکھتے تھے، میں نے خود دیکھا ہے مغرب کی نماز اور اس کے بعد اوراد و وظائف سے ایک گھنٹہ سے کم میں فارغ نہیں ہوتے تھے ان کے دل میں پوری ملتِ اسلامیہ کا بڑا درد اور اس کے مسائل و معاملات کا بڑا احساس تھا، ان کا ابرکرم ہند اور بیرون ہند کے اسلامی اداروں پر برستا رہتا تھا، علی گڑھ یونیورسٹی کی بھی لاکھوں سے مدد کی، وہ محض خانہ پری کے لئے چانسلر نہیں تھے، بلکہ یونیورسٹی کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتے اور صلاح و مشورہ میں برابر شریک رہتے تھے، میرے زمانۂ قیام میں علی گڑھ کئی مرتبہ تشریف لائے، اس موقع پر اساتذہ وغیرہم سب سے ملتے اور یونیورسٹی کے معاملات پر گفتگو فرماتے، دینیات کی فیکلٹی میں جو کام ہو رہا تھا اس سے واقف تھے اور مسرت کا اظہار کرتے تھے، ایک مرتبہ مجھکو خاص طور پر تنہائی میں یاد فرمایا اور اسلام اور مسلمانوں پر دیر تک گفتگو کرتے رہے، اسی اثنا میں میں نے عرض کیا کہ میں فیکلٹی آف تھیالوجی کو اسلامی علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم کا ایک مرکز (INSTITUTE OF ADVANCED ISLAMIC STUDIES) کی شکل میں دیکھنے کا متمنی ہوں اور اس کے بعد میں نے اس کا خاکہ پیش کر کے عرض کیا کہ کم از کم پچیس لاکھ روپیہ سے اس کا آغاز ہو سکتا ہے، تو چند سوالات اور ان کے جوابات کے بعد مسرت کے اظہار کے ساتھ فرمایا: "آپ اللہ کا نام لے کر شروع کیجئے اور یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط کے ماتحت مختلف مراحل و منازل سے گزرنے کے بعد جب اسکیم پختہ ہو جائے تو چند روز کے لئے میرے پاس بمبئی چلے آئیے۔" مگر افسوس ہے ۱۹۶۵ء میں ایک شدید زلزلہ آیا تو سارے حوصلے پست ہو گئے اور وہ بساط کہن ہی الٹ گئی۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

سیدنا یونیورسٹی کے جس کسی فنکشن میں شرکت فرماتے وہاں طلباء اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ننگے سر ان سے سامنا نہ ہو، ان کو اس طرح کی باتیں بہت بری لگتی تھیں، علی گڑھ میں قیام کے دنوں میں ایک روز ضرورتمند طلبار کی ملاقات کے لئے مخصوص ہوتا تھا، پہلے سے دن اور وقت کا اعلان ہوجاتا اور اس کے مطابق جناب موصوف اپنے سکریٹری اور اکاونٹنٹ کے ساتھ مولانا آزاد لائبریری میں آکر بیٹھ جاتے طلبار یکے بعد دیگرے اپنی درخواست کے ساتھ ان کے سامنے پیش ہوتے اور آپ درخواست پڑھوا کر سننے کے بعد اس پر حکم صادر فرماتے اور اکاونٹنٹ صاحب حکم کی فوراً تعمیل کر دیتا، اس طرح سینکڑوں طلبار کی ضرورت رفع ہوجاتی اور بے ساختہ ان کے دل سے دعائیں نکلتی تھیں۔

نواب سر احمد سعید خاں آف چھتاری | نواب صاحب اس زمانہ میں پرو چانسلر تھے اور آج کل چانسلر ہیں۔ نواب صاحب سرسید کی بزم کہن کی وہ شمع روشن ہیں کہ اگر کوئی پوچھے کہ سرسید علی گڑھ سے کس قسم کے لوگ پیدا کرنا چاہتے تھے تو "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" کے مطابق فوراً بے تکلف نواب صاحب کی طرف اشارہ کر دیجئے اور فخر سے کہئے: "ایسے" سرسید کا اصل مقصد و منشا علامہ اقبال کے لفظوں میں "دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر اینست" کے سوا اور کیا تھا! نواب صاحب جنھوں نے سرسید کی آنکھیں دیکھی ہیں[1] اس مصرع کا صحیح مصداق ہیں، انگریزوں کے زمانہ میں کسی صوبہ کا گورنر یا حیدرآباد ایسی عظیم ریاست کا وزیراعظم ہوجانا ایک ہندوستانی کی معراج تھی، نواب صاحب ان دونوں پر بڑے جاہ و جلال کے ساتھ فائز رہے، ساتھ ہی عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے پکے اور سچے مسلمان۔ اسلامی اخلاق و عادات اور مشرق کی وضعداری اور رکھ رکھاؤ کا ایک پیکر حسین بھی، قرآن مجید کے حافظ ہیں اور اس کا اتنا اہتمام کرتے ہیں کہ گورنری کے زمانہ میں بھی محراب سنانی ناغہ نہیں کی، تین برس پہلے عید کے موقع پر میں حاضر

---

[1] آپ کی تاریخ پیدائش ۱۲ جنوری ۱۸۸۹ء ہے، اس حساب سے سرسید کے انتقال کے وقت آپ نو برس کے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوا تو مسرت کے ساتھ فرمایا: میں نے اس سال ۶۹ ویں محراب سنائی ہے، بے شبہ: ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ۔ پھر خود نواب صاحب نہیں، بلکہ عورتیں اور مرد، بوڑھے اور جوان، چھوٹے اور بڑے سب ہی دیندار اور کٹر مذہبی ہیں۔ نواب صاحب کو یونیورسٹی سے محبت نہیں عشق ہے، وہ اس کے تمام اہم معاملات و مسائل میں پوری دلچسپی لیتے ہیں، کبرسن کے باوجود یونیورسٹی کی تمام تقریبات میں پابندی سے شریک ہوتے، گھنٹوں بیٹھے رہتے اور تقریر کرتے ہیں، ان کی ایک معین سالانہ رقم ہے جس سے طلباء کی مدد کرتے ہیں، یوں بھی دست گرداں کوئی ضرورتمند پہونچ جائے تو بے نیل مرام نہیں آتا۔ خاندانی وجاہت اور ذاتی اوصاف و کمالات کے باعث ہندو مسلمانوں اور گورنمنٹ، سب کے ہاں بڑی عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، نواب صاحب نے "یادِ ایام" کے نام سے اپنی خودنوشت سوانح عمری عمدہ کتابت و طباعت اور کاغذ کے ساتھ تین جلدوں میں شائع کردی ہے جو بڑی دلچسپ، بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں ڈاکٹر صاحب برصغیر انڈوپاک کے مشہور فاضل، مورخ، ادیب اور مصنف ہیں، انگریزی، فرانسیسی اور اردو، تینوں زبانوں میں آپ کی تصنیفات موجود ہیں جو معیاری اور بلند پایہ ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں عرصہ تک تاریخ اور سیاسیات کے استاد رہنے کے بعد جب وہاں سے سبکدوش ہوئے تو زیدی صاحب کی نظر انتخاب نے ان کو تاڑا اور یہ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ آ گئے، ڈاکٹر صاحب پختہ عقیدہ اور کردار کے مسلمان ہیں، اس معاملہ میں وہ کبھی اس درجہ جذباتی ہو جاتے ہیں کہ عام مسلمانوں کا ان کے ساتھ چلنا مشکل ہو جاتا ہے، اعلیٰ درجہ کے پٹھان ہونے کے باعث وہ بالکل صاف ستھرے اور کھرے آدمی ہیں، مصلحت پسندی کا ان کے ہاں گذر ہی نہیں، وہ الفاظ کو چبانا اور حقائق کو گھما پھرا کر بیان کرنا نہیں جانتے، جو بات دل میں ہے اس کو برملا کہنے میں ان کو اس بات کا ڈر نہیں کہ اس سے "عزت سادات" رہے گی یا جائے گی، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کے برادر خورد ہیں، لیکن افتادِ طبع اور مزاج کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق تھا، بڑے بھائی کا عمل حسرت کے اس شعر پر تھا:

ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات
سنے نہ کوئی مرے دل میں یا دہن میں رہے

لیکن برادر خورد کی طبیعت کا آئینہ دار یہ شعر ہے:

فاش می گویم و از گفتہ، خود دل شادم
بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا گوشۂ خاطر اسلام پسند گروپ کی طرف تھا وہ اس کو چھپاتے نہیں تھے اور اکاڈمک کونسل، اکزکٹو کونسل اور کورٹ، غرض کہ جہاں کہیں موقع ہوتا وہ اس کا اظہار کئے بغیر نہ رہتے تھے، لیکن اب غالباً ڈاکٹر صاحب نے محسوس کرلیا ہوگا کہ اسلام پسندی کا وہ شور و غوغا محض ذاتی اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے تھا اور اسلام کی محبت اور دین کے ساتھ مخلصانہ تعلق سے ہرگز اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا، بہرحال مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو قلبی تعلق اور لگاؤ ہونا چاہیئے وہ تو تھا ہی۔ مزید برآں علی گڈھ سے ڈاکٹر صاحب کا دیرینہ اور خاندانی رابطہ بھی تھا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے بحیثیت پرو وائس چانسلر کے اپنے عہدہ کا حق ادا کردیا۔ انھوں نے بڑی جانفشانی، محنت اور ایمانداری سے اپنے منصبی فرائض و واجبات انجام دیئے، ان کو طلباء کے ساتھ اور طلباء کو ان کے ساتھ محبت تھی، حقیقت یہ ہے کہ اس عہدہ کا وقار ان کی ذات کے ساتھ قائم تھا۔ انھوں نے کوشش کی کہ یونیورسٹی کی اسلامی، علمی اور ادبی فضا میں سرگرمی اور جوش کے ساتھ استحکام بھی پیدا ہوجائے، کبھی کبھی زیدی صاحب اور ڈاکٹر صاحب میں اختلاف رائے شدید ہوجاتا تھا۔ لیکن پھر جلد ہی صلح صفائی بھی ہوجاتی تھی، ڈاکٹر صاحب نے بھی "یادوں کی دنیا" کے نام سے اپنی سوانح عمری لکھی ہے جو کافی ضخیم ہے، مگر ساتھ ہی بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

حاجی عبیدالرحمٰن خاں صاحب شیروانی | حاجی صاحب اس زمانہ میں ٹرسٹی رہ چکے تھے، آپ نے اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انتہائی ذمہ دارانہ اور نازک عہدہ کے فرائض و واجبات جس محنت و مشقت اور دل کی لگن کے ساتھ انجام دیتے اس کی مثال اس زمانہ میں عنقا ہے، وہ اس عہدہ کی کوئی تنخواہ نہیں لیتے تھے لیکن کام اس انہماک سے کرتے تھے کہ صبح کو دس بجے کے قریب دفتر آتے اور شب میں نو ساڑھے نو کے قریب ہی وہاں سے نکلتے تھے۔ حاضر حواسی کا یہ عالم تھا کہ دفتر کی ایک ایک چیز پر ان کی نظر رہتی تھی، چھٹری رپورٹ میں مالیات سے متعلق شدید اعتراضات کی صفائی اور یونیورسٹی کی ان سے برأت کے سلسلے میں جو کچھ ریمارک کیا گیا ہے اور جو پہلے گذر چکا اور اس میں حاجی صاحب کی سوجھ بوجھ اور قابلیت کو بڑا دخل ہے، حاجی صاحب جو نواب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ہیں ان کے خاندان کا علی گڑھ اور سرسید سے جسم و جان کا تعلق رہا ہے، اسی تعلق کا نتیجہ ہے کہ حاجی عبید الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے اپنا لاکھوں روپیہ کا ..... اور انتہائی بیش قیمت نوادر پر مشتمل کتب خانہ یونیورسٹی کی نذر کر دیا۔ موصوف ایک زمانہ میں چند مہینوں کے لئے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، اس وقت بھی یونیورسٹی سے ایک پیسہ نہیں لیا اور اب بھی کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے، ایک اچھے مسلمان کی پہچان یہی ہے کہ اس کے دیکھنے سے خدا یاد آئے اور نیکی کی ترغیب ہو۔ موصوف اسی قسم کے مسلمان ہیں، ایک عربی شاعر نے اپنے ممدوحین کے جو اوصاف گنائے ہیں وہ آپ پر بھی صادق آتے ہیں۔ کہتا ہے:

هينون، لينون، ايسار ذوو كرم
سواس مكرمة ابناء ايسار

ترجمہ: یہ لوگ نرم خو اور نرم طبیعت ہیں، خوش حال اور ارباب کرم[1] ہیں، بزرگیوں کے بانی

---

[1] اردو میں کرم کا لفظ مہربانی کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے، لیکن عربی میں اس کے معنی نہایت وسیع ہیں اور جملہ فضائل و کمالات اخلاقی پر مشتمل ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور خوشحال لوگوں کی اولاد ہیں (یعنی نو دولتیے نہیں ہیں)

رجسٹرار، وائی، ڈی خاں | زیدی صاحب کے زمانہ میں اسلام پسند اور ترقی پسند گروپوں میں جو کشمکش بپا رہتی تھی اس کی تان غریب رجسٹرار اور اس کے دفتر پر ٹوٹتی تھی، جہاں اکاڈمک کونسل یا اکزکٹو کونسل یا کورٹ کی میٹنگ شروع ہوئی اور گزشتہ میٹنگ کی کارروائی پڑھی گئی کہ رجسٹرار پر سوالات کی بوچھار شروع ہوگئی، ایک صاحب فرماتے ہیں: "فلاں آیٹم کی نسبت جو فیصلہ ہوا تھا اس کا اندراج غلط ہوا ہے"۔ ایک دوسرے نے کہا: "رزولیوشن یہ منظور ہی نہیں ہوا تھا تو رپورٹ میں اسے منظور کیسے لکھدیا گیا ہے" تیسرے نے شکایت کی کہ "میٹنگ کا ایجنڈا قاعدہ کی رو سے پندرہ دن پہلے آنا چاہیئے تھا لیکن رجسٹرار آفس سے ابھی چار دن پہلے آیا ہے" چوتھے بولے: "فلاں مسئلے پر میں نے جو تقریر کی تھی رپورٹ میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ پانچویں نے ارشاد فرمایا: فلاں پوسٹ کے متعلق سلکشن کمیٹی نے جو فیصلہ کیا تھا رجسٹرار کی رپورٹ میں اس کا اندراج اشتباہ انگیز لفظوں میں ہوا ہے، غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں، رجسٹرار اور اس کا دفتر سخت پریشان رہتا تھا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ سب سوالات بے معنی ہی نہ ہوتے تھے۔ بلکہ جیسا کہ حبیب جی کمیٹی کی رپورٹ میں درج ہے۔ رجسٹرار آفس سے چھوٹی بڑی فروگذاشتیں اور غلطیاں ہوتی بھی رہتی تھیں، اس بنا پر زیدی صاحب کو خیال ہوا کہ رجسٹرار کی پوسٹ کے لئے کوئی پرانا تجربہ کار اور لائق و محنتی شخص لایا جائے اور اس کو اختیار دیا جائے کہ اسسٹنٹ رجسٹرار کی متعدد پوسٹوں پر اپنے ڈھب اور پسند کے آدمیوں کا تقرر کرے، چنانچہ انھوں نے جستجو شروع کی اور آخرکار وائی۔ ڈی (غالباً یار وداد) خاں صاحب کو رجسٹرار کی پوسٹ پر لے آئے، موصوف اس سے پہلے ایک عرصہ تک پونا میں کام کر چکے تھے اور اس بنا پر بڑے تجربہ کار اور منجھے ہوئے تھے۔ انگریزی بہت اچھی لکھتے تھے، یونیورسٹیوں کے طریق کار سے خوب واقف تھے، دفتری نظم و نسق میں بڑی مہارت تھی اور نہایت مستعد، چست اور ہمہ وقت حاضر حواس آدمی تھے، جب وہ علی گڑھ آئے ہیں اس وقت ان کی عمر ۵۰، ۵۵ برس کی ہوگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اس کے باوجود انھیں کام کی دھن اور محنت کی لگن ایسی تھی کہ صبح کو دس بجے کے قریب آفس میں بیٹھتے تو شام کو ۷، ۸ بجے کے قریب ہی وہاں سے نکلتے تھے اور پھر بھی جب قیام گاہ پر آتے تو فائلوں کا پلندہ ان کے ساتھ ہوتا تھا اور وہ سونے سے پہلے اور سونے کے بعد پلنگ پر بیٹھے بیٹھے انھیں پڑھتے تھے۔ انھوں نے رجسٹرار آفس کے نظم و نسق میں بہت سی مفید اور کارآمد اصلاحات کیں اور اس عہدہ کے وقار کو اونچا کیا، اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ زیدی صاحب یونیورسٹی کے لئے جو کچھ کرسکے اس میں دفتری کاموں کے اعتبار سے خاں صاحب کی مستعدی، تجربہ کاری اور محنت ولیاقت کا بھی بڑا حصہ ہے، اکاڈمک کونسل وغیرہ میں رجسٹرار پر جو لے دے ہوتی تھی خاں صاحب کے آنے کے بعد اس کا سلسلہ ختم تو نہیں ہوا۔ لیکن بہت کم ہوگیا، اگر کوئی بات ان سے پوچھی جاتی تو فوراً اس کا معقول جواب ملتا تھا۔

کسی اڈمنسٹریشن کے حسن و قبح کا دار و مدار موقع و محل، زمان و مکان اور متعلقہ افراد واشخاص پر ہوتا ہے، جاگیرداری اور آمریت کے زمانہ میں اڈمنسٹریشن کا جو طریقہ کامیاب ہوسکتا تھا وہ جمہوریت کے دور میں نہیں ہوسکتا اور کسی گورنمنٹ کے سکریٹریٹ میں اچھے اڈمنسٹریشن کے لئے جو باتیں ضروری ہیں وہ اگر بعینہا یونیورسٹی میں اختیار کی جائیں تو ان سے نقصان پہونچ سکتا ہے، جہاں تک جمہوریت کے عہد اور اس کے دور میں ایک اچھے اڈمنسٹریٹر میں جو اوصاف و کمالات ہونے چاہیئے بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ زیدی صاحب کو ان میں بہرۂ وافر ملا ہے، انھیں خود بھی اس کا احساس تھا۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا: "میرے نکتہ چیں اگر یہ کہیں کہ میں علمی آدمی نہیں ہوں تو میں اسے تسلیم کرلوں گا۔ لیکن میں اس بات کو کیسے مان سکتا ہوں کہ مجھے اڈمنسٹریشن بھی نہیں آتا۔"

مسٹر بدرالدین طیب جی ۱۹۶۲ء کے آخر میں زیدی صاحب سبکدوش ہوگئے تو ان کی جگہ جناب بدرالدین طیب جی کا تقرر ہوا۔ موصوف سوا دو برس کے قریب وائس چانسلر رہے، حکومت ہند کے محکمہ خارجہ میں اڈیشنل سکریٹری اور سینئر آئی۔ سی۔ ایس تھے اس لئے ڈسپلن ان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گھٹی میں پڑا تھا۔ دماغ صاف ستھرا اور بے گنجلک تھا، وہ سچے اور کھرے انسان اور غیر معمولی جرأت وجسارت کے مالک تھے، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ان کی اپنی کار، اپنے ملازم، اپنے برتن اور اپنا فرنیچر یہ سب چیزیں یونیورسٹی کی چیزوں سے الگ تھیں، ان کے گھر میں کسی کی مجال نہ تھی کہ یونیورسٹی کی کوئی معمولی سے معمولی چیز بھی گھر کے کام میں لائے۔ ان کا بچہ نرسری میں پڑھتا تھا اس کی والدہ خود اپنی کار میں اسے روزانہ لے جاتی اور پھر واپس لاتی تھیں۔ وہ اس رعب داب کے آدمی تھے کہ ضلع کا افسر بھی وقت کے تقرر اور ان کی اجازت کے بغیر ان سے ملاقات نہیں کرسکتا تھا۔ اس بنا پر کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے یونیورسٹی کا وقار۔ اور مرتبہ بلند کیا، ایک مرتبہ شہر میں فرقہ وارانہ کشیدگی تھی، بدرالدین طیب جی کو معلوم ہوا کہ بارہ سینی کالج کے ہندو طلبا ر ایک میٹنگ کررہے اور حسب معمول ایک جلوس نکالنے کا ارادہ کررہے ہیں، مغرب سے پہلے جھٹپٹے کا وقت تھا، وہ اسپورٹس شیمین کے لباس میں فوراً اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ سیدھے کالج پہونچ گئے، طلبا پر ان کی اس جرأت اور صاف دلی کا غیر معمولی اثر ہوا اور انھوں نے وعدہ کیا کہ جلوس نہیں نکالیں گے، علاوہ ازیں انھوں نے حکام ضلع کو بھی چوکنا کیا اور خود بھی رات میں کئی مرتبہ شہر کا گشت کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک وہ رہے فرقہ وارانہ فساد کا پتہ بھی کبھی نہیں کھڑکا۔ ایک اخبار نے ایک مرتبہ یونیورسٹی کے متعلق ایک غلط سلط فتنہ انگیز خبر چھاپ دی، بدرالدین طیب جی کو علم ہوا تو اڈیٹر کو بلاکر جواب طلب کیا اور کہا: "اخبار کی آئندہ اشاعت میں نمایاں طور پر اس غلط خبر کی تردید ہوجانی ضروری ہے، ورنہ میں اخبار کا لائسنس منسوخ کرادوں گا۔" چنانچہ اخبار میں خاطر خواہ طور پر تردید شائع ہوگئی۔

بدرالدین طیب جی موروثی طور پر کٹر نیشنلسٹ تھے، لیکن ان کے ہاں نیشنلزم کا تصور یہ کبھی بھی نہیں رہا کہ بڑی مچھلی کو چھوٹی مچھلی کے ہڑپ کرلینے کی اجازت دے دی جائے۔ ان کو اس کا بھی یقین تھا کہ مسلمانوں کے ملی وجود کے بقا کا دار و مدار ان کے مذہب، ثقافت اور روایات کے زندہ رہنے پر بھی ہے، اس بنا پر علی گڑھ میں ایک دو مرتبہ نہیں مختلف جلسوں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جلسوں میں بار بار بڑی قوت سے کہا کہ یہاں آکر مجھے اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا کہ اگرچہ اس درس گاہ کے دروازے کسی پر کبھی بند نہیں ہوئے، لیکن اس کے قیام کا اولین مقصد مسلمانوں کی تعلیم وتربیت تھا اور پھر فرماتے کہ جس طرح یہ مقصد سرسید کے زمانہ میں تھا اسی طرح آج بھی اس کا مقصد یہی ہونا چاہئے۔ موصوف کو اپنے اس خیال کی صداقت کا اس درجہ یقین تھا کہ جب ایک مرتبہ یہ افواہ اڑی کہ یونیورسٹی کے نام سے لفظ "مسلم" خارج کیا جائے گا تو انھوں نے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہا کہ میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا اور اگر گورنمنٹ نے اس معاملہ میں دھاندلی کی تو میں فوراً استعفا دے دوں گا۔

چٹرجی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں طلبار کے داخلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ جو طلبار ایک مرتبہ یونیورسٹی میں داخل ہو کر یونیورسٹی برادری کا جز ہو گئے ان کا حق ہے کہ آئندہ داخلہ کے معاملہ میں ان کو باہر والوں پر چند شرائط کے ساتھ ترجیح دی جائے، بدرالدین طیب جی کا وہ خیال تو تھا جس کا ابھی ذکر ہوا۔ اب رپورٹ کی اس سفارش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے اکاڈمک کونسل سے یہ بات منظور کرالی کہ انجینیرنگ کالج میں خود اپنے یونیورسٹی کے طلبار کے داخلہ کا تناسب ۵۰ فی صد ہوگا۔ میں بیرون ہند تھا اس لئے اکاڈمک کونسل کی اس میٹنگ میں شریک نہ تھا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا بیان ہے کہ "جب انھوں (بدرالدین طیب جی) نے یہ مسئلہ اکاڈمک کونسل کے سامنے پیش کیا تو یہ بھی کہا کہ میں نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیرمین ڈاکٹر کوٹھاری سے اس کے متعلق گفتگو کرلی ہے اور وہ میری رائے سے متفق ہیں"[1] چنانچہ اس پر عمل ہونے لگا اور انجینیرنگ کالج میں مقامی اور غیر مقامی طلبار کا یہ تناسب قائم ہو گیا۔ لیکن جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ کسے خبر تھی کہ دو برس کے بعد یہی چیز یونیورسٹی کے

---

[1] "یادوں کی دنیا" ص ۳۰۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لئے ایک شدید بھونچال ثابت ہوگی۔

جسٹس بشیر احمد سعید صاحب نے آل انڈیا مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی کے کنونشن منعقدہ دہلی۔ مارچ ۱۹۶۷ء میں جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اس میں انھوں نے کہا ہے: "بدرالدین طیب جی نے یونیورسٹی میں حکمرانی ایسی ہی کی جیسے ایک ضلع کا حاکم ضلع پر کرتا ہے، وہ اکزکٹو کونسل، اکاڈمک کونسل اور کورٹ کے ممبروں کا بہت کم لحاظ کرتے تھے" (ص ۱۰) لیکن مجکو اس ریمارک سے اتفاق نہیں ہے، اگر جسٹس بشیر احمد سعید صاحب بجائے "ضلع کے حاکم" کے یہ کہتے کہ بدرالدین طیب جی کا اڈمنسٹریشن انگریزوں کے اڈمنسٹریشن جیسا تھا تو میرے نزدیک یہ بات صحیح ہوتی" حقیقت یہ ہے کہ ایک علی گڑھ ہی نہیں، بلکہ آزادی کے بعد سے دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی طرح سب ہی یونیورسٹیوں کا حال یہ ہوگیا ہے کہ اکاڈمک کونسل، سنڈیکیٹ، اور کورٹ وغیرہ کی میٹنگس میں وہ سنجیدگی اور متانت نہیں ہوتی جو ہونی چاہیئے اور یہ اچھی خاصی بحث ومناظرہ کی مجلسیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کی یہ مجلسیں مقابلتہً پھر بھی بہت غنیمت اور سنجیدہ ہوتی تھیں اور ان میں ہلڑبازی نہیں ہوتی تھی، بااینہمہ چند گنے چنے حضرات ایسے بھی تھے جو موقع بے موقع اور ایک ہی چیز پر بار بار بولنے کے عادی تھے اور چونکہ زیدی صاحب ایک عوامی طبیعت رکھتے تھے اس لئے ان کے ہاں تقریروں پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی، نتیجہ یہ تھا کہ اکاڈمک اور اکزکٹو کونسل وغیرہ کی میٹنگس پانچ چھ گھنٹے اور کبھی صبح وشام دونوں وقت چلتی تھیں۔ بدرالدین طیب جی ڈسپلن کے معاملہ میں زیدی صاحب سے بالکل مختلف آدمی تھے، انھوں نے اکاڈمک کونسل اور اکزکٹو کونسل وغیرہ کی میٹنگس کو کنٹرول کیا، وہ بار بار اور بے ضرورت کسی کو نہیں بولنے دیتے تھے اس لئے جو حضرات زیادہ بولنے کے عادی تھے ___ اور

لہ اس سلسلہ میں میں اپنا ایک ذاتی تجربہ اور مشاہدہ دہلی یونیورسٹی کے اس دور کا جب کہ سرمارس گوائر وائس چانسلر تھے اپنے کسی مضمون میں لکھ چکا ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جسٹس بشیر احمد سعید صاحب کا شمار بھی انھیں حضرات میں تھا۔ انھیں بدرالدین طیب جی کی اس روک ٹوک سے طبعاً بیزاری ہونی ہی چاہیئے تھی، تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بدرالدین طیب جی میں ایک قسم کی حاکمانہ ضد اور ہٹ تھی، وہ جس بات پر اڑ گئے، اڑ گئے، اپنے سامنے کسی کی چلنے نہیں دیتے تھے، اسی وجہ سے بعض حضرات نے تو اکاڈمک کونسل کی میٹنگ میں آنا بالکل ہی ترک کر دیا تھا، اور اکزکیٹو کونسل اور کورٹ کی میٹنگس میں بھی وہ پہلی سی ہماہمی اور چہل پہل نہ رہی تھی۔

ان کی ضد کی وجہ سے ایک مرتبہ مجھے بھی بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ہوا یہ کہ شعبۂ سنی دینیات میں دو لکچرروں کا انتخاب ہونا تھا .... ان میں ایک لکچرر۔ کم۔ ناظم دینیات کی پوسٹ تھی اور دوسری لکچرر برائے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کی، جب ان دونوں جگہوں کے لئے امیدواروں کا انٹرویو ہوچکا اور بدرالدین طیب جی نے میری رائے معلوم کی تو میں نے دو امیدواروں کا نام لیا، یہ سنتے ہی طیب جی کا موڈ بگڑ گیا اور انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں زور دے کر فرمایا: "پہلی پوسٹ کے لئے آپ نے جس کی سفارش کی ہے، یہ نرے مولانا ہیں، انگریزی سے بالکل نابلد۔ پھر یہ یونیورسٹی کے طلباء کو کیا فائدہ پہونچا سکتے ہیں۔ دوسرے امیدوار کی نسبت تمسخر کے انداز میں فرمایا: "مانا کہ یہ ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی ہیں، لیکن یہ پوسٹ تو مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی ہے، امیدوار نے جب ویدوں کا اور عہد نامۂ قدیم وجدید کا مطالعہ ہی نہیں کیا تو اس پوسٹ کا حق کیونکر ادا ہوسکتا ہے"۔ میں نے عرض کیا: میرے نزدیک ایک امیدوار کی عمدہ صلاحیت اور متعلقہ پوسٹ کے لئے اس کے استحقاق کی دلیل یہ ہے کہ امیدوار کو اپنے مضمون کے ساتھ شغف اور والہانہ تعلق ہو، اس کا مطالعہ برابر جاری رہے اور اس نے تحقیق اور تصنیف وتالیف کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دی ہوں۔ اس کے بعد میں نے کہا: اس معیار پر یہ دونوں امیدوار پورے اترتے ہیں۔ چنانچہ یہ ان کے مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کو ملاحظہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرمائیے، اس سے میری بات کی تصدیق ہوگی، اب رہی یہ بات کہ یہ حضرت انگریزی نہیں جانتے تو واقعہ یہ ہے کہ میں خود انگریزی کو ایک لکچرر کے لئے ضروری شرط قرار دیتا ہوں، لیکن یہ پوسٹ اس لکچرر کی ہے جسے ناظم دینیات کی حیثیت سے بھی کام کرنا ہوگا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس پوسٹ پر ایک باقاعدہ عالم، متشرع اور متدین کا تقرر ہو تاکہ ناظم دینیات کی پوسٹ کا تقدس برقرار رہے، اس لئے اس شخص کے حق میں میرے نزدیک انگریزی کی شرط پر اصرار کرنا مناسب نہ ہوگا۔ دوسرے امیدوار کی نسبت میں نے کہا: یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ امیدوار نے ہندو مذہب اور یہودیت وعیسائیت کا سرے سے مطالعہ کیا ہی نہیں ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں جو سوالات انٹرویو میں ان سے کیے گئے تھے ان کے جوابات انھوں نے ایسے ضرور دیے ہیں کہ ان کو پچاس فی صد نمبر دیے جاسکتے ہیں)، یہ مستعد، محنتی اور علمی و تحقیقی ذوق کے آدمی ہیں اس لئے میں نگرانی رکھوں گا۔ امید ہے وہ اپنی خامی جلد پوری کرلیں گے۔

لیکن طیب جی کہاں ماننے والے تھے، چار پانچ منٹ ان کے اور میرے درمیان کشمکش رہی، اس موقع پر اکسپرٹ حضرات حسب دستور خاموش رہے، آخر جب میں نے کہا: "وائس چانسلر صاحب! جن دو شخصوں نے اسلامیات پر محنت کی ہے، ریسرچ اور تحقیق کر کے قابل قدر علمی خدمات انجام دی ہیں، اگر ان کو اپنی محنت اور ذوق وشوق کی داد مسلم یونیورسٹی میں بھی نہیں مل سکتی تو کہاں ملے گی؟ وائس چانسلر صاحب یہ سنتے ہی ہنس پڑے اور موقع پاکر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب بھی میری حمایت میں بولے تو فرمایا: "بہت اچھا! آپ کو اتنا اصرار ہے تو یہی سہی! لیکن یہ یاد رکھئے کہ ان دونوں کا تقرر حسب قاعدہ ایک برس کے لئے آزمائشی ہوگا، اس ایک برس میں ایک صاحب کے لئے انگریزی میں اچھی خاصی استعداد کا بہم پہنچانا ضروری ہوگا اور دوسرے کو یہ بتانا ہوگا کہ انھوں نے سال بھر میں ہندو مذہب اور یہودیت وعیسائیت پر آپ کی ہدایت کے مطابق کتنی کتابیں باقاعدہ پڑھی ہیں، اور پھر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعد دوسے کر فرمایا: اب ان دونوں کی نگرانی آپ کا کام ہے، سال پورا ہونے کے بعد جب تک آپ اپنی رپورٹ میں ان دونوں باتوں کا مجھے اطمینان نہیں دلائیں گے میں ان کو مستقل (Confirmed) نہیں کروں گا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ طیب جی کا معاملہ طلبار کے ساتھ بہت نرم اور دلجوئی کا اور اساتذہ کے معاملہ میں وہ سخت تھے۔ میرے نزدیک یہ شہرت غلط نہیں تھی لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ طلبار کو اپنی اولاد سمجھتے تھے اس کے ساتھ گھلے ملے رہتے تھے، ان کے ساتھ کھیلوں میں حصہ لیتے، باقاعدہ گھوڑے کی سواری کرتے، تالاب (Swimming pool) میں ان کے ساتھ غسل کرتے اور تیرتے تھے، میں نے خود تو نہیں دیکھا اوروں سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ طلبار کسی ہال میں ڈنر کھانے بیٹھے، لیکن کھانا جو سامنے آیا تو بے حد خراب! لڑکوں نے اسٹرائک کردی اور وائس چانسلر کی کوٹھی پر پہونچے، طیب جی اس وقت گھر کے اندر بے تکلفی کے ساتھ صرف بنیان اور نیکر پہنے بیٹھے تھے، ان کو لڑکوں کی آمد کا حال معلوم ہوا تو فوراً اسی حالت میں باہر نکل آئے، لڑکوں نے ان کو گھبرایا ہوا اور اس لباس میں دیکھا تو بولے "قبلہ! آپ نے لباس تو ٹھیک پہن لیا ہوتا" بدرالدین طیب جی نے جذباتی انداز میں کہا: ہیں! میرے بچے کسی وجہ سے پریشان ہو کر میرے مکان پر آئیں اور میں کپڑے بدلنے میں دیر لگاؤں! یہ کیسے ہوسکتا ہے!" لڑکے آئے تھے احتجاج کرنے، مگر وائس چانسلر کا رویہ اس درجہ مشفقانہ دیکھا تو کچھ کہے سنے بغیر واپس جانے لگے، بعد میں بدرالدین طیب جی کو لڑکوں کے آنے کی غرض و غایت کا علم ہوا تو اس وقت جو کچھ گھر میں موجود تھا وہ لاکر لڑکوں کے سامنے رکھ دیا اور پرووسٹ کو حکم بھیجا کہ آئندہ وہ کھانے کے خراب ہونے کی شکایت نہ سنیں، لڑکوں کے ساتھ اس تعلق خاطر کے باعث لڑکوں کی معمولی فروگذاشتوں اور غلطیوں سے درگزر کرتے تھے، لیکن جو جرائم خباثتِ نفس کا مظہر ہوتے تھے ان پر یونیورسٹی کے قواعد وضوابط کے ماتحت ان کو سزا دینے میں بھی تامل نہیں ہوتا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے برعکس اساتذہ کا معاملہ دوسرا تھا، بدرالدین طیب جی کی نگاہ اس پر تھی کہ اساتذہ کی ذمہ داریاں بڑی نازک اور اہم ہیں، ملک اور قوم کے معمار درحقیقت یہی لوگ ہیں، نوجوانوں کے مستقبل کا بننا اور بگڑنا انھیں کی فرض شناسی اور اس سے کوتاہی اور غفلت پر مبنی ہے، اس بنا پر اساتذہ کو علم وعمل اور اخلاق کے اعتبار سے طلبار کے لئے ایک نمونہ ہونا چاہئے، لیکن افسوس ہے، علم اور اخلاق میں باہمی سمبندھ کے منقطع ہو جانے کے جو المناک مظاہر پورے ملک میں نظر آتے ہیں علی گڑھ یونیورسٹی کی فضا بھی ان سے خالی نہ تھی، یہاں بھی ایسے اساتذہ (اور بعض اونچے درجہ کے) موجود تھے جو سرِ شام اسٹاف کلب میں (کچھ بیگمات کے ساتھ اور کچھ تنہا) پہونچ جاتے اور شب میں بارہ ایک بجے سے پہلے گھر واپس نہیں لوٹتے تھے، کلاس پابندی سے نہیں جس کے باعث کورس مکمل نہیں ہوتا تھا، بعض شعبوں کے صدر صاحبان کا تو یہ حال تھا کہ سال میں دو چار کلاسیں لیں اور پھر غائب! دفتر کے چپراسی سے گھر کا کام لیتے تھے، شعبہ کے فرنیچر کی بعض چیزیں بے تکلف اپنے گھر لے جاتے تھے، یونیورسٹی میں جو پرووسٹ صاحبان اور وارڈن ہوتے تھے ان میں بعض حضرات روپیہ پیسہ کے معاملہ میں غیر محتاط تھے، لڑکوں کے روپیہ سے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کی دعوت کرنے میں انھیں تامل نہیں، پھر یہ مرض تو اس ملک میں ہمہ گیر ہے کہ اپنی یونیورسٹی یا کسی اور یونیورسٹی کے کام سے کہیں کا سفر کیا ہے اور سفر خرچ فرسٹ کلاس کا لیا ہے، حالانکہ سفر تھرڈ کلاس میں ہوا ہے، یا ایک ہی شہر میں دو مختلف اداروں میں گئے ہیں اور دونوں جگہوں سے الگ الگ فرسٹ کلاس کے دو سفر خرچ لئے ہیں۔ بدرالدین طیب جی کو طالب علمی کے زمانہ کے علاوہ اور خصوصاً آزادی کے بعد کے زمانہ میں (جب کہ ہماری تعلیم گاہوں کے زمین و آسمان ہی بدل گئے ہیں) کبھی کسی یونیورسٹی سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اس بنا پر اب انھوں نے اساتذہ اور انتظامیہ میں اس قسم کے لوگ دیکھے تو غصہ کے ساتھ ان کو اس کا شدید رنج اور صدمہ ہوا اور آدمی چونکہ دبنگ تھے، پروا کسی بات کی کرتے نہیں تھے۔ اس لئے کسی شخص کی بے عنوانی اور قانونی خلاف ورزی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے علم میں آئی انھوں نے اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے میں ذرا تامل نہیں کیا۔ بعض اونچے درجہ کے سینیر پروفیسر تھے ان تک کو معطل کرنے میں پس وپیش نہیں کیا، ایک پروفیسر جو چند روز پہلے ہی اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے ان کی نسبت معلوم ہوا کہ طلبار کے فنڈ کے دس ہزار روپے ہڑپ کرگئے ہیں، بدرالدین طیب جی نے ان کو فوراً بلایا اور کہا: یہ روپیہ آج شام تک فنڈ میں جمع ہوجانا چاہئے، ورنہ میں معاملہ پولیس کے سپرد کردوں گا، ایک ہڈ کلرک کی نسبت پتہ چلا کہ داخلہ کے معاملہ میں اس نے رشوت لے لی ہے، اسے فوراً معطل کردیا گیا۔ عام طور پر ہوتا یہ تھا کہ ادھر کوئی شخص معطل ہوا اور اس نے کورٹ میں رٹ داخل کردی۔ بدرالدین طیب جی سوا دو برس کے قریب علی گڑھ میں رہے ہیں، لیکن اس مختصر مدت میں بھی جس کثرت سے لوگ ان کے زمانہ میں معطل ہوئے اور جتنے رٹ یونیورسٹی کے خلاف ان کے زمانہ میں داخل ہوئے کسی وائس چانسلر کے عہد میں ایسا نہیں ہوا، ان کے عہد کی بھی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے جسٹس بشیر احمد سعید صاحب نے ان کی حکومت کو ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی حکومت کہا ہے لیکن موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ یونیورسٹی کے اسٹاف اور اس کے عملہ میں یہ خرابیاں تھیں یا نہیں؟ اگر تھیں اور یقیناً تھیں تو ان کو دور کرنے اور ان کی اصلاح کی شکل اس کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی! چنانچہ اساتذہ اور عملہ میں جو ایماندار، محنتی اور فرض شناس لوگ تھے وہ سب بدرالدین طیب جی کے مداح اور قدردان تھے لیکن جن کے خلاف انھوں نے تادیبی کارروائی کی تھی وہ اور ان کے ہم خیال وہم مشرب انھیں کیوں پسند کرسکتے تھے، البتہ طلبار ان پر جان چھڑکتے تھے اور پروانہ وار ان پر فدا تھے۔

جب وہ اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوکر علی گڑھ سے روانہ ہوئے ہیں تو اس وقت طلبار نے جس گرم جوشی، والہانہ محبت اور تعلقِ خاطر کے جذبات کے ساتھ انھیں رخصت کیا ہے وہ پورا منظر دیدنی تھا۔ زیدی صاحب کی رخصت کے وقت تو میں ہندوستان میں ہی نہ تھا اس وقت اسٹیشن پر میں بھی موجود تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود ان تک پہونچنا ممکن نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوسکا۔ میں ذاتی طور پر بھی ان کی عنایت وکرم اور توجہ کا شکر گزار ہوں۔ ان کے ہاں جو لنچ یا ڈنر ہوتا تھا اس پر وہ ڈین صاحبان کو باری باری بلاتے تھے، لیکن مجھکو ہر موقعے پر یاد فرماتے اور علم وفن، شعر وادب اور مذہب وسیاست کے مختلف موضوعات پر بے تکلف گفتگو کرتے تھے

بہرحال اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بدرالدین طیب جی نے یونیورسٹی کے طلبار اور اساتذہ وملازمین میں خود اعتمادی اور عزتِ نفس کا جذبہ پیدا کیا، ان کو یہ سکھایا کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ دوسرے تمھاری عزت کریں تو پہلے تم خود اپنی عزت کرنا سیکھو، ان میں فرض شناسی کی خو پیدا کی، یہ واقعہ ہے کہ ان کے عہد میں بڑے سے بڑا فرقہ پرست ہندو بھی یونیورسٹی کی طرف ترچھی نظر کرتے ہوئے ڈرتا تھا ضلع کے حکام اور پولیس کے افسران ہوشیار اور چوکنا رہتے تھے اور یونیورسٹی تو یونیورسٹی! ان کی وجہ سے شہر کے مسلمان بھی چین کی نیند سوتے تھے۔

ان کی فطرت میں صداقت پسندی اور حق گوئی کا جو جوہر قدرت نے ودیعت رکھا ہے اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اپنے سرکاری عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد سے اب تک انھوں نے انگریزی کے بلند پایہ اخبارات ورسائل میں بیسیوں مضامین لکھ ڈالے جن میں انھوں نے گورنمنٹ کی مختلف پالیسیوں اور کاموں پر اس قدر سخت تنقید کی ہے کہ ایوان پارلیمنٹ کے درو بام بھی گونج اٹھے۔ مسلمانوں نے ان کو اپنا لیڈر بنانا چاہا، مختلف جماعتوں نے ان پر ڈورے ڈالے اور ہر ایک نے ان کو اپنانے کی سعی کی۔ لیکن انھوں نے مسلم پرسنل لا اور بعض چیزیں جن کے ساتھ مسلمانوں کا گہرا جذباتی تعلق ہے ان کی نسبت اپنی رائے صاف صاف ظاہر کر کے انھیں مایوس کر دیا اور وہ ان کمند بازوں سے یہ کہتے ہوئے ترت نکل گئے:

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ!

© rasailojaraid.com